Oriental College Magazine, Vol.99, No. 04, Serial No. 374, 2024

طنزیہ و مزاحیہ عناصر اور بیسویں صدی کا اُردو ناول

غفور احمد، پی ایچ ڈی
لیکچرار اُردو
گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج، قصور

HUMOROUS AND SATIRICAL ELEMENTS
AND THE URDU NOVEL OF TWENTIETH CENTURY

Ghafoor Ahmad, PhD
Lecturer in Urdu
Government Islamia Graduate College, Kasur

Abstract

Describing the realities and facts of human life with all the circumstantial details into literary writings is rightly termed Novel Writing. Irony and Satire are rich colors of humorous life and these colors came into existence with the beginning of the Urdu Novel. Therefore, in this article, Urdu novel writing, in the light of satire and humor has been reviewed, before the establishment of Pakistan in general and post establishment novel writing in particular. The satirical and humorous elements in the twentieth century's Urdu novel have been explored; categorized, classified and new trends that flourished in it are introduced.

Keywords:
Human Life, Novel, Urdu, Satirical, Irony, Satire

ہر زمانے میں انسان کو دل بہلانے کے وسائل کی تلاش رہی ہے تا کہ وہ اپنی جسمانی تکان، پریشانی اور الجھن کا سدِباب کر سکے۔ اس ضمن میں قصہ کہانی اس کی بہترین رفیق رہی ہے۔(۱) یہ کہانی رفتہ رفتہ داستان کے پیرایے میں ڈھلی اور دنیا بھر کے ادب میں مقبول ترین صنف ٹھہری لیکن جب بنی نوع انسان کی ذہنی بلوغت ایک خاص درجے کو پہنچی تو وہ ان داستانوں کو اپنی زندگی کی حقیقتوں کے قریب لے آیا۔ یہیں سے جدید افسانوی ادب کی جملہ اصناف کا آغاز ہوا۔ ناول بھی اسی افسانوی ادب کی ایک صنف ہے۔ ناول داستانوں کے بعد ادب کو زندگی کے قریب لانے کی ایک شعوری کوشش ہے۔ ناول نگار مختلف انسانی معاملات، ان کے تعلقات، ان کے احساسات، ان کی محبتوں، نفرتوں، ان کے رویوں اور ان کے ماحول کو موضوعی یا معروضی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ زندگی کی ایک تصویر اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس میں زندگی کا فلسفہ اور فکر دی جاتی ہے۔(۲) اس کا دائرہ کار انسانی زندگی سے عبارت ہے۔

ناول ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام پہلو، اس کی ساری جزئیات اور سارے امکانات، اس کے ماجرے میں سمائے ہوئے ہیں تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ طنز و مزاح سے کوئی ناول یکسر خالی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ماجرے کی نوعیت یا موضوع کی نزاکت خالصتاً مزاح کے لیے سازگار نہ ہو لیکن طنز سے یکسر خالی ہونا ممکن نہیں ہے۔ سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور اخلاقی پہلوؤں میں طنز سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو ناول کے آغاز سے ہی طنز و مزاح جزوی طور پر اس میں سمایا ہوا ملتا ہے۔ نذیر احمد کے ہاں مرزا ظاہر دار بیگ جیسے کردار کی تخلیق اس کی واضح مثال ہے۔ ان کے ناول ''ابن الوقت'' کی عمومی شہرت کا سبب یہی طنزیہ عناصر ہیں جو ایک سطح پر ہونے والی تہذیبی ہل چل کی نشان دہی کرتی ہے۔ اسی طرح پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانہ آزاد'' میں ''خوجی'' ایک ایسا زندہ کردار ہے جس کے بارے ڈاکٹر عبدالسلام نے کہا تھا کہ خوجی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سرشار کی ناول نگاری کی غرض و غایت محض ظرافت ہے ہنسنا ہنسانا، فقرہ بازی، ضلع جگت اس میں قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔(۳) خوجی کے بارے میں ڈاکٹر عبدالسلام کی رائے بہت وقیع ہے لیکن کلی طور پر اس کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ خوجی کی غرض و غایت محض ظرافت سے بڑھ کر ہے، وہ ایک زوال پذیر معاشرے کی نفسیاتی الجھنوں کی نہ صرف عمدہ تصویر ہے بلکہ ایک پورا عہد اس ناول میں سمایا ہوا ہے۔ عبدالحلیم شرر اور مرزا ہادی رسوا کی تخلیقی دنیا کا پس منظر یکسر مختلف ہونے کے باوجود دونوں کے ہاں طنز و مزاح کے جواہر ریزے بکھرے ہوئے ہیں۔ عبدالحلیم شرر اور راشد الخیری کی ناول نگاری میں تاریخ اسلام کے درخشاں دور اور

اصلاح نسواں کے حوالے سے طنزیہ عناصر ملتے ہیں۔ مرزا رسوا نے اُردو ناول نگاری کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ اودھ کے معاشرتی زوال کی علامت کو اس طرح پیش کیا کہ ''امراؤجان'' اور 'گوہر مرزا' جیسے مرقع کردار تخلیقی منظر نامے پر اُبھرے۔ پریم چند نے نہ صرف ہندوستانی دیہات میں استحصال زدہ طبقے اور سود خور نظام میں جکڑے ہوئے غریب کسانوں کی خوب صورت عکاسی کی ہے بلکہ طنز کے نشتر سے اصلاح احوال کی کوشش کی ہے۔ طنز و مزاح کا یہ سفر قیام پاکستان کے بعد کی ناول نگاری میں بھی جاری رہتا ہے۔ ان ناولوں میں طنز و مزاح کی وہ کیفیت تو نہیں ملتی ہے جو آزادی کے بعد پاکستانی اُردو ناول نگاری میں نظر آتی ہے لیکن مستقبل میں طنز و مزاح کے امکانات اور حربوں کو مضبوط بنیاد ضرور فراہم کرتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد وطن عزیز کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو گیا۔ نئی صنعتوں کا قیام عمل میں لایا گیا جس کے نتیجے میں پاکستانی عوام کی معاشی حالت بہتر ہوئی۔ افسانوی ادب میں اس تعمیر و ترقی کا ذکر کم ملتا ہے اور انسانی جذبات و احساسات کے ساتھ ہونے والے المیوں کو زیادہ موضوع بنایا گیا۔ اگرچہ کچھ ناول نگاروں کے ہاں معاصر حالات کا ذکر بھی ضمناً مل جاتا ہے لیکن عمومی طور پر تقسیم کے نتیجے میں ہونے والی ہل چل اور شکست و ریخت کا ذکر زیادہ نمایاں ہے۔

قیامِ پاکستان سے ۱۹۶۰ء تک کے ناولوں میں طنزیہ و مزاحیہ عناصر کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کم و بیش تیرہ سال کا یہ عرصہ پاکستانی اُردو ناول کے ارتقا میں ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان برسوں میں شائع ہونے والے ناولوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ زیادہ تر لکھنے والے ادیب وہی ہیں جو تقسیم سے پہلے بھی لکھ رہے تھے مثلاً قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر احسن فاروقی، شوکت تھانوی، عصمت چغتائی، کرشن چندر، سجاد ظہیر، عزیز احمد اور نسیم حجازی وغیرہ۔ البتہ کچھ نام ایسے بھی ہیں جنھوں نے اس دور میں اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز کیا اور پھر بیسوی صدی کے نصف آخر پر چھائے رہے۔ اس دور کی تخلیقات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنے والا دور اُردو ناول کے لیے یقیناً ایک زرخیز دور ہو گا۔ مستقبل میں اُردو ناول کی روایت مضبوط ہو گی اور دیگر افسانوی ادب کے مقابلے میں یہ صنف زیادہ اُبھر کر سامنے آئے گی۔ اس عہد کے آخر میں شائع ہونے والے ناولوں میں خدا کی بستی اور آگ کا دریا ایسے ناول قرار پاتے ہیں جنھوں نے افسانوی ادب میں اپنا سحر تا حال برقرار رکھا ہوا ہے۔ موخر الذکر ناول آگ کا دریا اپنی تکنیک، موضوع، مواد اور اُسلوب کی بنا پر آج بھی انفرادیت رکھتا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت جو حالات پیش آئے انھوں نے اس عہد کی ہر تخلیق کو متاثر کیا۔ نسیم حجازی کے سارے ناولوں میں یہ نظریاتی کسک موجود ہے۔ ان کے علاوہ عزیز احمد کے ناول ایسی بلندی ایسی پستی، قرۃ العین حیدر کے ناولوں میرے بھی صنم خانے، سفینہ غم دل اور آگ کا دریا انتظار حسین کے ناول چاند گہن نثار عزیز بٹ کے ناول نگری نگری پھرا مسافر، شوکت صدیقی کے ناول خدا کی بستی اور الطاف فاطمہ کے ناول نشان محفل میں یہی نظریاتی مباحث کسی نہ کسی حد تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ مختلف موضوعات میں سمویا ہوا یہ مشترک پہلو شعوری یا لاشعوری طور تقسیم کے وقت پیدا ہونے والے نامساعد حالات کی پیداوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے ناولوں میں عام طور پر ایک ایسی فضا ملتی ہے جس سے احساس ہوتا ہے کہ تقسیم سے منسلک واقعات ایسے ہیں جن کی شدت آنے والے منظر نامے کو بھی دھندلائے رکھے گی۔ محمد حسن نے اس دور کی الم ناک صورت حال کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

> ”تقسیم نے اس خواب دیکھنے والے نوجوان کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ تو صرف خواب دیکھتا رہا۔ اور حقیقتوں نے اسے چُور چُور کر ڈالا۔ اس نے سماج کے جن توہمات اور تعصبات کو اپنے خیال و خواب کی دنیا میں کچل ڈالا تھا وہ اس شدت سے ابھرے کہ ان کی بنیاد پر ملک، تہذیب، خاندان، گھر بار، حتیٰ کہ انسان کا وجود تقسیم ہو گیا۔ فرد کے اعتقادات اور اقدار خارجی زندگی کی حقیقتوں سے اس طرح ٹکرائے کہ شیشوں کے ٹکڑوں کی طرح بکھر گئے۔ تقسیم کا یہ کرب ایسا تھا جو ایک مدت تک اُردو ناول پر قابوس کی طرح مسلط رہا۔“(۴)

۱۹۴۷ء کے بعد جو ناول پاکستان میں تخلیق ہوا، اس ناول کا بیش تر حصہ اپنے عہد، سماج اور ہم عصر تاریخ سے منسلک ہے۔(۵) ایسا ہونے کی وجوہات بالکل فطری ہیں۔ ادیب اپنی تمام تر حساسیت کے باوجود اسی جہان آب و گل کا پروردہ ہوتا ہے۔ وہ بھی اسی عہد میں سانس لیتا اور زندگی گزارتا ہے جس میں باقی انسان رہ رہے ہوتے ہیں۔ چناں چہ اس عہد کے ناول میں تقسیمِ ہندوستان کی بازگشت بڑی واضح سنائی دیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان سالوں میں مزاح کی نسبت طنز کا پلڑا بہت بھاری ہے۔ مزاح کے تکنیکی حربوں میں وہ تنوع موجود نہیں ہے جو طنز کے باب میں ہے۔ لیکن پھر بھی ڈاکٹر احسن فاروقی، شوکت تھانوی، فضل کریم فضلی، نسیم حجازی اور محمد خالد اختر کے ہاں بین السطور ایسے واقعات مل جاتے ہیں کہ ناول کا قاری مسکرائے بغیر نہیں گزر سکتا۔ مجموعی طور پر اس دور کے پاکستانی اُردو ناول میں سیاسی، سماجی اور مذہبی حوالوں

سے طنزیہ پیرایہ اظہار اختیار کیا گیا ہے اور طنز کے دیگر مختلف حربوں کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ ذیل میں ان برسوں کے نمایاں ناولوں میں طنزیہ و مزاحیہ عناصر کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

اس عہد کے اگلے اہم ناول نگار عزیز احمد اور محمد احسن فاروقی ہیں۔ایسی بلندی ایسی پستی عزیز احمد کا اہم ناول ہے۔ زمانی اعتبار سے یہ ناول ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی نو آبادیاتی فضا کو موضوع بناتا ہے۔الگ الگ کردار اس ناول میں خیر اور شر کے مختلف پیمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بدعنوانی اور شراب نوشی کے مضمرات کو بھی ناول کے ماجرے کا حصہ بنایا گیا ہے۔ مزاح پیدا کرنے کے لیے وہ لفظی بازی گری، معاشرتی ناہمواریوں کے بیان اور لطیفہ گوئی کے حربوں سے کام لیتے ہیں۔طنز میں سماجی اور معاشی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں۔ عزیز احمد کی طرح محمد احسن فاروقی کا شمار بھی ایسے ناول نگاروں میں ہوتا ہے جو تقسیم سے قبل لکھ رہے تھے۔ شام اودھ اور آبلہ پا اسی عہد میں شائع ہونے والے ناول ہیں۔ محمد احسن فاروقی کے ہاں لکھنؤ کی نوابی زندگی کا دورِ زوال اور معاصر عہد کے دیگر پہلوؤں کے عمدہ مرقعے ملتے ہیں۔ تیزی سے مٹتی ہوئی اقدار پر نوحہ کناں اشرافیہ کو خود بھی یہ احساس ہو چلا ہے کہ اس غیر فطری اور مستعار نظام زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ ایک لکھنوی نواب کا اپنی بیگم سے یہ کہنا کہ ”بیگم یہ سب ڈھول جو نوابی کا ہے اس وقت یہ ایک دن بھٹ سے پھوٹ بہے گا اور اس کے اندر سے خول نکلے گا“(۶) اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے۔اس ناول میں معاشی اور اخلاقی قدروں کی پامالی پر طنز زیادہ نمایاں ہے۔ مزاحیہ عناصر کے حوالے محمد احسن فاروقی پیروڈی، لفظی بازی گری اور واقعاتی مزاح کو بڑی عمدگی سے استعمال کرتے ہیں۔اکبر الہ آبادی کے ایک شعر کی پیروڈی بھی ناول کے بیانیے کا حصہ ہے۔

قرۃ العین حیدر کے تین ناول میرے بھی صنم خانے، سفینہ غم دل اور آگ کا دریا اس عرصے میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد وہ بھارت سدھار گئیں اور بقیہ تخلیقی زندگی کے شب و روز وہیں بسر ہوئے۔ میرے بھی صنم خانے میں سیاسی، تہذیبی، فرقہ ورانہ اور طبقاتی کش مکش پر طنز ملتا ہے۔سفینہ غم دل ایک طرح سے اول الذکر ناول ہی کی توسیع ہے۔ اس کے زیادہ تر کردار آدرشی نوعیت کے ہیں اور مختلف نظریات پر بلا تکان بحثیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ نظریوں کے ابطال کو بھی کسی قدر طنزیہ پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ آگ کا دریا ایک وسیع کینوس کا حامل ناول ہے اور قرۃ العین حیدر کے فن کی نمائندگی کرتا ہے۔ زمانی و مکانی وسعتوں میں یکے بعد دیگرے نابغہ روزگار کردار ناول کے منظر نامے پر

طلوع ہوتے ہیں اور پھر اچانک کسی چھلاوے کی طرح کسی اور کردار میں ڈھل جاتے ہیں۔ ان کرداروں کی مناسبت سے وقت کے بے پایاں جبر کو بھی ناول کے بیانیے کا حصہ بنایا گیا ہے۔ کہیں کہیں وہ لفظوں اور لب و لہجے کے الٹ پھیر سے مزاح کی ہلکی پھلکی لہریں پیدا کرنے میں کام یاب تو ہو جاتی ہیں لیکن اظہار میں طنزیہ عناصر کے بیان ایسی کیفیت نہیں بن پاتی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صلاح الدین درویش کی اس رائے سے متفق ہونا ہی پڑتا ہے کہ آگ کا دریا کا سارا ماحول اپنے اندر گہری سنجیدگی لیے ہوئے ہے۔ طنز اور مزاح سے بعض معمور جملے بھی قاری کو ہنسانے یا مسکرانے کی بجائے مزید سنجیدہ بنا دیتے ہیں۔"(۷) ظاہر ہے کہ قرۃ العین جس قسم کے موضوعات کو اپنے ناولوں کا حصہ بناتی ہے اور جس قسم کا اُن کا اُسلوب ہے اس میں مزاح کی آمیزش قابل عمل نہیں ہے۔ مزاح کے برعکس طنزیہ عناصر کے مختلف حربوں کی بڑی توانا مثالیں ان کے ناولوں میں مل جاتی ہیں۔ سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشی اور طبقاتی حوالوں سے ناہمواریوں پر طنز کے بڑے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ نو آبادیاتی عہد کے ہندوستان کو انھوں نے جس نظر سے دیکھا اور دکھایا ہے وہ ایک الگ نقطہ نظر ہونے کے باوجود اس وقت اہمیت اختیار کر لیتا ہے جب وہ انگریزوں کی آمد کے بعد مقامی صنعتوں کی بربادی کا ذکر کرتی ہیں یا پھر ایک کردار کی زبانی "کمپنی بہادر نے وچن ہمارے بادشاہوں کو دیے اور ایک ایک کر کے سب کو توڑا۔" ایسے بلیغ طنز پر مبنی جملے ناول کے بیانیے کا حصہ بناتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری کے ضمن میں اس قسم کی کچھ اور مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔

شوکت تھانوی اور محمد خالد اختر دو ناول نگار ایسے ہیں جنھوں نے فکاہیہ نوعیت کے ناول لکھے۔ شوکت تھانوی کا اُسلوب سادہ اور پیش کش روایتی ہے۔ وہ تکنیک، ہئیت اور کردار نگاری میں کوئی نیا تجربہ نہیں کرتے۔ اسی عہد میں شامل اُن کا ناول چار سو بیس مرکزی کرداروں مسعود اور ناہید کی محبت کو موضوع بناتا ہے۔ شگفتگی اور مزاح بڑے منظم انداز کے ساتھ ناول کے ماجرے میں گندھا ہوا ہے۔ عملی مزاح، رعایت لفظی، جگت بازی، لفظی بازی گری اور مضحک صورت احوال سے مزین ہے لیکن مجموعی طور یہ ایک سادہ ناول ہے۔ ان کے برعکس محمد خالد اختر کا جہانِ تخلیق نہ صرف عالمی ادب سے بہرہ ور ہے بلکہ اُن کے اُسلوب پر اس کے اثرات کی واضح جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ "بیس سو گیارہ" ایک ایسا فنتسائی ناول ہے جس کا تاروپود ہی طنز و مزاح کے مختلف حربوں سے تشکیل پاتا ہے۔ مزاح کے حوالے سے مضحک صورت احوال، رعایت لفظی اور پیروڈی ان کے مخصوص حربے ہیں۔ ن۔ م راشد اور فیض احمد فیض کی نظموں کی پیروڈی بھی ناول میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور صورت اردو مخففات کی مضحک تشکیل

ہے۔ پل۔ جک۔ مچ (پکڑلو جس کو مرضی چاہے) اور کہکع (کھلی ہوا کے عاشق) ایسے بہت سے مخففات مزاح کے عمدہ حربے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ طنزیہ حوالے سے بھی "بیس سو گیارہ" اپنی مثال آپ ہے۔ قومی اور بین الاقوامی سیاسی رویوں، معاشی صورت حال اور اخلاقی زوال کی جو طنزیہ و فکاہیہ تصویر کشی اس ناول میں کی گئی اس کی مثال اب تک کے اُردو ناول میں ناپید ہے۔

اس عہد میں انتظار حسین بہ طور ناول نگار متعارف ہوتے ہیں۔ چاند گہن اُن کا پہلا ناول ہے۔ ماضی کی خوش گوار یادوں سے مملو یہ ناول بعد میں شہرت حاصل کرنے ناول بستی کا نقطہ آغاز ہے۔ کم و بیش وہی انداز اور حربے ہیں جو بعد میں انتظار حسین کی انفرادیت قرار پائے۔ ہندی اساطیر کے مطابق مظاہر فطرت کی مضحک توجیہات اس ناول کے قاری کو ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ طنزیہ عناصر میں انتظار حسین، تہذیبی، سیاسی، سماجی صورت احوال میں ہونے والی تیز رفتار تبدیلیوں کو اس طرح طنزیہ سامنے لاتے ہیں کہ وہ اس تبدیلی سے نالاں دکھائی دیتے ہیں۔

اس دور کے ناول دیگر نگاروں میں نثار عزیز بٹ، فضل کریم فضلی، شوکت صدیقی اور الطاف فاطمہ اہم ناول نگار ہیں۔ "نگری نگری پھرا مسافر" کا شمار نثار عزیز بٹ کے عمدہ ناولوں میں ہوتا ہے۔ ایک ذہین نسوانی کردار 'افگار' پورے ناول کے ماجرے پر چھایا ہوا ہے۔ اسی کردار کی زبانی وہ خود ساختہ سماجی اور مذہبی رویوں پر طنز کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ فضل کریم فضلی کا ناول خون جگر ہونے تک بنیادی طور پر قحط بنگال کو موضوع بناتا ہے۔ بہتر تفہیم کے لیے ناول کے با آسانی دو حصے کیے جاسکتے ہیں۔ اولین حصے میں زندگی اپنی تمام تر چہل پہل کے ساتھ سرسبز بنگال میں وقوع پذیر ہے۔ ناول کے اسی حصے میں جمعدار صاحب جیسا مضحک اور زندہ دل کردار پیش کیا گیا ہے۔ بنگالی لب و لہجے میں ثقیل اُردو، فارسی اور عربی الفاظ کا تلفظ بڑی مضحک صورت پیدا کرتا ہے۔ اس خطے میں مجید، موزید بن جاتا ہے اور مستنصر باللہ موچھن بلا کے تلفظ سے بدل جاتا ہے۔ اس حصے میں مذکور بالا کردار جمعدار صاحب کی پر مزاح زندگی قاری کو ہر لمحہ محظوظ کرتی ہے۔ ناول کے دوسرے حصے میں مشرقی بنگال کے پس منظر کا براہِ راست مشاہدہ اور لمحہ لمحہ خوف ناک قحط کی طرف بڑھتی ہوئی کیفیت ملتی ہے۔ اس وجہ سے یہاں مزاح کی جگہ طنز کے مختلف حربے زیادہ مستعمل ہیں۔

شوکت صدیقی کا خدا کی بستی اس دور کا عمدہ اور وقیع ناول ہے۔ قیام پاکستان کے بعد نو تشکیل معاشرہ جن بحرانوں سے دوچار ہو رہا ہے اور جس قسم کی سماجی، اخلاقی اور معاشی اکھاڑ پچھاڑ ہو رہی ہے وہ بڑی عمدگی سے ناول میں سموئی ہوئی ہے۔ اس ناول کی کہانی سماجی جبر اور نظام زر کے تحت ہونے والے

طبقاتی استحصال کے گرد گھومتی ہے۔ یہی وجہ ہے اس ناول میں مزاح نہ ہونے کے برابر ہے۔ شوکت صدیقی کے ہاں سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشی اور اخلاقی حوالے سے طنز پورے ناول میں بکھرا ہوا ہے۔ سیاست، اقتدار اور کاروبار کا گٹھ جوڑ جس معاشی استحصال کو جنم دیتا ہے وہ اپنی کسی نہ کسی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ اس سلسلے کا اگلا ناول الطاف فاطمہ کا "نشان محفل" ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے تین مرکزی کرداروں، پروفیسر نادر، روبینااورایبک کی مثلث کے ذریعے ایک تہذیبی آمیزش اور آویزش کو پیش کیا ہے۔ انگریزی عہد کا ہندوستان اور تقسیم کے بعد پنجاب اور بنگال کی فضا بھی ناول کے ماجرے میں ملتی ہے۔ طنزیہ حوالے سے ناول کا آخری حصہ بہت جان دار ہے۔ قیام پاکستان کے فوراًبعد ابھرنے والے معاشرتی اور معاشی رویوں پر بڑی عمدگی سے طنز کیا گیا ہے۔

پاکستانی ناول نگاری کے ان بیس برسوں (۱۹۶۱ءسے ۱۹۸۰ءتک) میں شائع ہونے والے مختلف ناول نگاروں کی تخلیقات کا جائزہ لیں تو ان مصنفین میں سے کچھ تو وہ ادیب ہیں جن کا ذکر قبل ازیں بھی ہو چکا ہے اور کچھ وہ لوگ ہیں جو فکشن کی دنیا میں نووارد ہیں۔ ان بیس برسوں میں شائع ہونے والے ناولوں کی تعداد تو بہت زیادہ نہیں ہے لیکن اس عرصے میں جمیلہ ہاشمی کا تلاش بہاراں، ممتاز مفتی کا علی پور کا ایلی، خدیجہ مستور کا آنگن عبداللہ حسین کا اداس نسلیں اور انتظار حسین کا بستی ایسے وقیع ناول ہیں جن پر ہر دور میں بات ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ ان ناولوں کی اشاعت سے اُردو ناول کو جو فروغ، پذیرائی اور اعتبار ملا وہ اس سے پیش تر نہیں مل سکا۔ایسے ہی فن پاروں کی بدولت اُردو ناول نگاری کے امکانات میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ اگر یوں کہا جائے کہ اس عہد کی ناول نگاری نے متاخرین کو سب سے زیادہ متاثر کیا تو بے جا نہ ہو گا۔ ذیل میں اس عہد کے اہم ناولوں میں موجود طنزیہ و مزاحیہ عناصر کی درجہ بندی کے اعتبار سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس عہد میں سب سے پہلے ناول نگار ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ہیں۔ ان کا ناول سنگم اسی دور کی یادگار ہے۔ محمد احسن فاروقی نے اس ناول میں دو مرکزی کرداروں، مسلم اور اوما پاروتی کے ذریعے تہذیبی تفہیم کی کوشش کی ہے۔سنگم میں ہندو مسلم تضادات کو بھی کہیں بالواسطہ اور کہیں بلاواسطہ طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کے تہذیبی زوال پر بہت بلیغ طنز ہے۔ اس کے بعد جمیلہ ہاشمی کا تلاش بہاراں اپنے موضوع، اُسلوب، ہیت اور تکنیک کی بنا پر انفرادیت کا حامل ہے۔ تقسیم کے قبل کا آگرہ شہر

اس ناول کا منظر نامہ ہے۔ کنول کماری ٹھاکر کے روپ میں ایسے لوگوں کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کا دھرم انھیں انسانیت کی خدمت اور اس کے احترام سے دور کر دیتا ہے۔ عورت کے سماجی حقوق کا تحفظ بھی اس ناول کا بڑا موضوع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنفہ نے اس نسوانی کردار کے ذریعے معاشی، معاشرتی اور مذہبی حوالے سے اپنا نقطہ نظر بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ ہندوؤں کی متعصبانہ سوچ اور مسلم کش رویوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ ناول کے موضوع کی سنجیدگی کی وجہ سے طنزیہ عناصر کی بہتات ہے۔ اسی عرصے میں ممتاز مفتی کا علی پور کا ایلی بھی منظر عام پر آیا اور تلاش بہاراں سے ہی مسابقت ٹھہری۔ دونوں ناولوں میں موضوع، مواد، ہئیت، تکنیک اور اُسلوب کسی حوالے سے بھی مشابہت نہیں تھی۔ باعث مسابقت یہی کہ 'آدم جی' ایوارڈ علی پور کا ایلی کے حصے میں نہ آسکا۔ لیکن یہ تو طے ہے کہ قبل ازیں کی اُردو ناول نگاری میں "علی پور کا ایلی" ایسا خود نوشت سوانحی تجربہ کسی ناول کے ماجرے میں سمویا ہوا نہیں ملتا۔ انھوں نے عملی اور واقعاتی مزاح، مضحک کردار نگاری اور مضحک اصطلاحوں سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انکر اینڈی ما باؤں، ہکوری ڈکوری، سارہ صبورہ اور ہم جولی ٹولی ایسی منفرد لیکن مضحک ترکیبات سے ناول کے ماجرے میں جا بجا شگفتگی پیدا کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے معاشرے کی فرسودہ روایات، جامد خیالات اور تغیر سے خائف رویوں کو بھی بڑے سلجھے انداز سے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ روایتی تعلیمی نظام میں موجود خامیوں کی نہ صرف بڑی عمدگی سے نشان دہی کی گئی ہے بلکہ طنز کے نشتر سے اسے قابل اصلاح بنانے کا عندیہ بھی دیا ہے۔

اس کے فوراً بعد خدیجہ مستور آنگن اور عبد اللہ حسین اداس نسلیں کے ساتھ افسانوی ادب کی دنیا میں اپنے پہلے پہلے ناول کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ بعد کی تخلیقی زندگی میں بھی یہی دو ناول دونوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فنی اور اُسلوبیاتی لحاظ سے دونوں مختلف ناول ہیں۔ ان میں وجہ اشتراک صرف تقسیم کا موضوع ہے۔ خدیجہ مستور نے آزادی کی تحریک کو ایک آنگن میں اور عبد اللہ حسین نے نسلوں کے تناظر میں بیان کیا ہے۔ دونوں ناولوں کے ابتدائی حصے اپنے اندر شگفتگی کی ایک لہر لیے ہوئے ہیں جو بعد ازاں ناپید ہو جاتی ہے۔ خدیجہ مستور نے مسلم لیگ اور کانگریس کی ساری آویزش کو فن کارانہ مہارت سے اس طرح بیان کیا ہے کہ اس میں سیاست اور سماج ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ اسی وجہ سے اس ناول میں خدیجہ مستور کے ہاں بھرپور سیاسی اور سماجی طنز ملتا ہے۔ اداس نسلیں کے اولین تین سو صفحات ہلکے پھلکے مزاح سے عبارت ہیں۔ مرکزی کردار نعیم سینئر کیمبرج کرنے کے باوجود ایک خاص دیہاتی پس منظر سے اُبھر کر سامنے آتا ہے

اس لیے یہاں زندگی کا رنگ زیادہ فطری اور شگفتہ ہے۔ اداس نسلیں کے بقیہ حصے میں بھی عبداللہ حسین کے ہاں گاہے گاہے زندگی کی چہل پہل کی طرف لوٹنے کی شعوری کوشش ملتی ہے۔ ناول کے انھی حصوں میں مضحک واقعات نگاری سے مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ البتہ مزاح کی نسبت دونوں ناولوں میں سیاسی اور سماجی طنز کی سطح بہت بلند ہے۔ تقسیم بنگال اور تنسیخ بنگال ہندوستان کی نو آبادیاتی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے اس کش مکش کے دوران اشرافیہ کے لیے یہ جملہ کہ "بنگال تقسیم ہو یا متحد رہے آپ کا رائل ٹائیگر کا شکار جاری رہے گا۔"(۸) عوامی لاتعلقی پر عمدہ طنز ہے۔ اسی طرح جاگیرداری نظام سے منسلک کاشت کاروں کے استحصال اور طبقاتی کش مکش پر بھی طنز کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ جنگ عظیم سے ہندوستانی عوام کا براہِ راست کچھ لینا دینا نہیں ہے لیکن ایک انگریز نو آبادی ہونے کی وجہ سے وہ بھی اس کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ اس جنگ کے لیے روشن پور میں ہونے والی جبری فوجی بھرتی میں ایک انگریز افسر جب سادہ لوح دیہاتیوں کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ سارے جوان جنگ ختم ہونے پر واپس آجائیں گے تو ایک دیہاتی بڈھا رحمت طنزیہ ہنستا ہے اور کہتا ہے کہ "جنگ میں اب خون ہونا بند ہو گیا ہے ہم تماشے پر جا رہے ہیں۔"(۹)

اگلا اہم ناول رضیہ فصیح احمد کا آبلہ پا ہے۔ اس ناول کے بھی اولین حصے میں شگفتگی کا عنصر زیادہ نمایاں ہے۔ مصنفہ نے لب و لہجے کے تغیر سے مضحک صورت حال پیدا کی ہے۔ یہاں موصل خان مونچھل خان کہلاتا ہے۔ اس ناول میں پہلی بار مشرق کے لسانی رویے پر بھی عمدہ طنز ملتا ہے مثلاً ایک عراقی، ایک ایرانی اور دو پاکستانیوں کا ایک چوتھی غیر مشترک زبان میں گفتگو کرنا مصنفہ کو گراں گزرتا ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے ہاں معاشی و سماجی ناہمواری کے متعلق شدید طنز ملتا ہے۔ انھوں نے بدعنوانی، پرمٹوں اور الاٹمنٹوں کی بندر بانٹ اور اقربا پروری ایسی لعنتوں کو کھل کر طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ طنزیہ و مزاحیہ حوالے سے اس عہد کا سب سے اہم ناول محمد خالد اختر کا چاکیواڑہ میں وصال ہے۔ اقبال حسین چنگیزی اور شیخ قربان علی کٹار ایسے مضحک کردار سب سے انوکھے، عجیب اور دل چسپ فنتسائی کردار ہیں۔(۱۰) مضحک کردار نگاری کے ساتھ ساتھ مضحک صورت احوال، لفظی بازی گری، مضحک اصطلاحات سازی اور تحریف نگاری کے حربے اسے مزید شگفتہ اور دل چسپ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید الرحمن نے بجا لکھا ہے کہ تحریف نگاری کے معاملے میں محمد خالد اختر نے اُردو ادب کو باثروت بنا دیا ہے۔(۱۱)

الطاف فاطمہ کے ناول دستک نہ دو کا عنوان ایک چینی شاعر کے مصرعے ”دستک نہ دو رسائی خود تم تک پہنچے گی“ سے ماخوذ ہے۔اس ناول میں جنگ کی ہول ناکی اور طبقاتی تفاوت پر طنز کو بڑے احسن انداز سے پیش کیا ہے۔ سید شبیر حسین کا ناول جھوک سیال دیہی زندگی میں جاگیر داری اور خانقاہی گٹھ جوڑ سے وجود میں آنے والے معاشی و معاشرتی استحصال کو موضوع بناتا ہے اور اسی حوالے سے طنز کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ نثار عزیز بٹ کے ”نے چراغے نے گلے“ میں نو آبادیاتی عہد میں اشرافیہ کے ٹھاٹ باٹ اور سماجی اقدار کی شکست و ریخت پر طنزیہ تبصرے ملتے ہیں۔ خالد فاروق کا ناول سیاہ آئینے مزاح سے یک سر خالی ہے۔ جرم کی دنیا اور ماجرے کی پُر اسراریت اس ناول کو غیر معمولی سنجیدہ بنا دیتی ہے۔ اسی حوالے سے سیاسی و سماجی طنزیہ عناصر ملتے ہیں۔ اکرام اللہ کا ناول گرگ شب اپنے موضوع کی حساسیت کی بنا پر ان دو عشروں میں اپنی ایک مخصوص انفرادیت رکھتا ہے۔ یہ ناول جس موضوع کو بیان کرتا ہے اس پر بات کرنا مشرقی معاشروں میں کسی طور مناسب نہیں سمجھا جاتا۔ بہر حال مصنف نے رشتوں کی نزاکت سے جڑے جنسی مسائل کو سماجی رویوں سے منسلک کیا ہے۔اس ناول میں مصنف فکشن کے پیرایے میں طنز کے نشتر سے اصلاح احوال کی شعوری کوشش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

انتظار حسین کا ناول بستی اس عہد میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مصنف کے ذاتی حالات کی پیش کش اسے خود نوشت سوانحی ناول بناتی ہے لیکن ہجرت اور آبادیوں کا جبری انخلا اسے آفاقی بیانیے سے منسلک کرتا ہے۔ناول کے ابتدائی حصے میں ہندو اساطیر کے حوالے سے مظاہرِ فطرت کی مضحک توجیہات کی گئی ہیں۔ یہ تکرار کسی حد تک ان کے ناول ”چاند گہن“ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ناول کے ماجرے میں مرکزی کردار کی غیر معمولی سماجی حساسیت اور غیر یقینی مستقبل کے اندیشے اسے جداگانہ حیثیت دیتے ہیں۔ خواب، نظریے اور خواہشات جن کا براہ راست تعلق معاشرے کی سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی اقدار سے ہے یہاں منہدم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی تناظر میں طنزیہ عناصر بھی بڑی عمدگی سے فن پارے میں سموئے ہوئے ہیں۔ اس دور کا آخری ناول پاگل خانہ جو حجاب امتیاز علی کی تخلیق ہے۔ غفور شاہ قاسم اس ناول کو ان کی بہترین تخلیقی کاوش اور Futuristic Literature کی مثال قرار دیتے ہیں۔ (۱۲) حجاب امتیاز علی نے اس ناول کی توسط سے تباہ کن مادی ترقی اور جدید آلات حرب خاص طور پر

ایٹمی ہتھیاروں کی ہول ناکی کو موضوع بنایا ہے۔ ان ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی اور تابکاری عناصر کی آئندہ نسلوں تک رسائی نے ناول نگار کے طنز کو زیادہ بامعنی اور جامع بنادیا ہے۔

بیسویں صدی کے آخری دو عشرے اُردو ناول کی روایت میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ پاکستانی اُردو ناول کے ان برسوں میں موضوعاتی تنوع، ہئیت، تکنیک اور اُسلوب کے نئے تجربات قاری کے سامنے آتے ہیں۔ ناول نگاروں کی ایک کثیر تعداد ہے جو اس دور میں سامنے آئی اور اُردو ناول کو اعتبار بخشا۔ بانو قدسیہ کا راجہ گدھ، رحیم گل کا جنت کی تلاش، غلام ثقلین نقوی کا میرا گاؤں، عبداللہ حسین کا نادار لوگ، صدیق سالک کا پریشر کُکر، جمیلہ ہاشمی کا دشتِ سُوس طارق محمود کا اللہ میگھ دے شوکت صدیقی کا جانگلوس اور مستنصر حسین تارڑ کے بہاؤ اور راکھ ایسے ناول اس دور میں شائع ہوئے اور قارئین و ناقدین کے ایک وسیع حلقے سے داد سمیٹی۔ اس دور کے دیگر اہم ناولوں میں الطاف فاطمہ کا چلتا مسافر انور سجاد کے دو ناول خوشیوں کا باغ اور جنم روپ، سلمیٰ اعوان کا تنہا، خدیجہ مستور کا زمین انتظار حسین کے دو ناول تذکرہ اور آگے سمندر ہے وغیرہ شامل ہیں۔ اس دور کے ناولوں میں ہئیت، تکنیک، مواد، موضوع، اُسلوب، پیش کش وغیرہ ہر لحاظ سے بے پناہ تنوع موجود ہے۔

غلام ثقلین نقوی کا ناول میرا گاؤں دیہی پس منظر میں انسانی زندگی کے مسائل کو اس طرح موضوع بناتا ہے کہ پاکستان کے سارے دیہات (گاؤں) کی نمایندگی ہو جاتی ہے۔ دیہی مسائل کے تناظر میں مصنف نے یہاں کی سیاسی و سماجی زندگیوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اسی عہد میں اگلے ناول نگار عبداللہ حسین ہیں جن کی ایک طویل وقفے کے بعد باگھ کے ساتھ افسانوی ادب کی دنیا میں واپسی ہوتی ہے۔ اداس نسلیں کی نسبت یہ ایک علامتی نوعیت کا ناول ہے۔ کچھ نقادوں نے فنی اور فکری حوالے سے اس کو اداس نسلیں سے بہتر ناول قرار دیا ہے۔ کشمیر کا ایک سرحدی گاؤں، کہانی کا منظر نامہ ہے جہاں ناول کے مرکزی کردار اسد اور یاسمین شگفتگی اور زندہ دلی کے ساتھ موجود ہیں۔ ناول کے اس حصے میں عبداللہ حسین نے واقعاتی مزاح کے حربوں سے کام لیا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے سیاسی، سماجی اور مذہبی پہلوؤں کے حوالے سے طنز کے بھی عمدہ حربے استعمال کیے ہیں۔ خاص طور پر روایتی مولویوں کا مناظرہ بہ یک وقت مضحک اور طنزیہ صورت حال کو پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد اُن کا ایک مختصر سا ناول قید منظر عام پر آتا ہے۔ اس کا مرکزی کردار ایک خاتون ہے۔ یہ نسوانی کردار ایسی خواتین کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی جگہ پست، کم ہمت

اور بے یار و مدد گار ہیں۔(۱۳) اس ناول میں قید ایک استعارہ جو نفسانی خواہشات کی اسیری پر مبنی ہے۔ انھی پہلوؤں کے حوالے سے مصنف نے سیاسی اور سماجی طنز کو اپنی فکر کی ترویج کے لیے استعمال کیا ہے۔ عبد اللہ حسین کا اگلا اہم ناول نادار لوگ ہے۔ کئی حوالوں سے ناقدین نے اسے بھی اداس نسلیں سے بہتر ناول قرار دیتے ہیں۔ باگھ اور نادار لوگ دونوں ناولوں کی یہ بد قسمتی ہے کہ یہ اداس نسلیں کے سحر سے نہ نکل سکے۔ ورنہ یہ ناول پاکستانی معاشرت، سیاست، جاگیر داری، طبقاتی کش مکش، مجموعی قومی و شخصی منفی رویے اور ہر سطح پر چھائی ہوئی منافقت کی دبیز لہر کو موضوع بناتا ہے۔(۱۴) دوسرے لفظوں میں یہ ناول قیام پاکستان کے بعد کی صورت حال پر ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جس کو نئے سرے سے کھنگالنے کی ضرورت ہے۔ ناول کے ماجرے میں سیاسی، تاریخی اور معاشرتی طنز کی مثالیں جابجا موجود ہیں۔ بعض جگہوں پر یہ طنز اتنا آفاقی اور ہمہ گیر ہو گیا ہے کہ معاصر پاکستانی سیاسی صورت حال پر اس کا اطلاق یکساں ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ مزاح کے حوالے سے عبد اللہ حسین نے اس ناول میں لفظی بازی گری، مضحک عرفیت (آصف گولڈ، برکی نیولا اور شوکی پانڈے وغیرہ) رعایت لفظی اور مضحک ازدواجی نوک جھونک کے حربوں سے کام لیا ہے۔ اس حوالے سے یہ اداس نسلیں کے بعد دوسرا اہم ناول ہے۔

اس عہد میں دو خواتین ناول نگاروں سلمٰی اعوان کا تنہا اور خدیجہ مستور کا زمین سامنے آتے ہیں۔ سلمٰی اعوان کا یہ پہلا ناول ہے جب کہ خدیجہ مستور قبل ازیں آنگن سے شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ خدیجہ مستور اس ناول میں پاکستانی سیاست اور معاشرت پر طنز کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جاگیر داری تناظر میں انتظامی مسائل کو بھی طنز کا موضوع بنایا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کم زور ناول ہے اور کہانی میں کوئی موضوعاتی اور فکری انفرادیت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس سلمٰی اعوان کا ناول تنہا اپنے موضوع، فن اور فکر کے حوالوں سے خاص انفرادیت کا حامل ہے۔ سلمٰی اعوان نے اس ناول میں سقوط ڈھاکہ کو ایک ادیب کی نظر سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام کا بیانیہ ایک سلجھے ہوئے انداز، ادبی توازن اور ذمہ دارانہ ٹھہراؤ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسی مناسبت سے فریقین کے سیاسی و سماجی رویوں کو ہدفِ تنقید بھی بنایا ہے۔ اگر اس ناول کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر نہ ہوتی تو اس کا شمار اس سانحے پر لکھے جانے والے اولیں ناولوں میں ہوتا۔

صدیق سالک کا ناول پریشر کُکر اپنے موضوع کی طرح فکری اعتبار سے بھی انفرادیت کا حامل ہے۔ یہ ناول زندگی کے نامساعد حالات کا جبر اور معاشرتی گھٹن کے زیر اثر کھولتے ہوئے انسان کو بڑی عمدگی سے موضوع بناتا ہے۔ حساس فرد جو ملک و قوم کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے اُس کے ساتھ روا رکھے جانے والے نامناسب سماجی، اخلاقی اور انتظامی رویے بالآخر اسے مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ پریشر کُکر کے سیفٹی والو کھول دے اور کہیں جنگلوں کی طرف نکل جائے۔ اس حوالے سے دیکھیں تو اس ناول کا عنوان ہی طنزیہ نوعیت کا ہے۔ صدیق سالک کی ادبی زندگی کا ایک نمایاں پہلو مزاح نگاری بھی ہے۔ یہی وجہ ہے اس ناول میں انھوں نے مزاح کے مختلف حربوں کو نہایت فن کارانہ مہارت سے استعمال لیا ہے۔ واقعاتی مزاح اور رعایت لفظی ان کے عام حربے ہیں۔ رعایت لفظی کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے: ”جہاز اُڑ چکا تو فطرت نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سامنے کی سیٹوں اور ان پر ابھرے ہوئے گنجے سروں کا اسکیچ بنانا شروع کر دیا۔ اب اسے کوئی جلدی نہ تھی کیوں کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر منجمد ہو چکے تھے اور جہاز کی روشنی گنجے اور چمک دار سروں کو اور چمک دار بنا رہی تھی۔ ایک آدھ سر جس پر بال تھے گنج ہائے گراں مایہ میں عجیب لگ رہا تھا۔(۱۵) علاوہ ازیں انھوں نے جگت بازی کو بھی ایک کام یاب حربے کے طور پر برتا ہے۔

سائرہ ہاشمی کا ناول درد کی رُت اور جمیلہ ہاشمی کا دشتِ سُوس بھی اسی عہد شائع ہوئے۔ سائرہ ہاشمی کے ہاں مختلف سماجی موضوعات کے متعلق طنز ملتا ہے کہ جب کہ جمیلہ ہاشمی نے اپنے ناول میں منصور بن حسین حلاج کو موضوع بنایا ہے۔ اس ناول میں تاریخ کے المیہ ہیرو (حسین بن منصور حلاج) کو ادب کا کردار بنا کر ایک نوع کا تخلیقی تجربہ کیا ہے۔ اس ناول میں موجود سوانحی اور داستانوی عنصر، روحانی و ذہنی اضطراب اور مابعد الطبیعیاتی تجربات کی صداقت کی تلاش اسے اہم ناولوں کی فہرست میں شامل کرتے ہیں۔(۱۶) ناول کے زمانی و مکانی تناظر میں مصنفہ نے اس دور کے مروجہ سماجی و مذہبی پیمانوں کو تنقید کا ہدف بنایا ہے۔ ان کے فوراً بعد شائع ہونے والا طارق محمود کے ”ناول اللہ میگھ دے“ کا موضوع بھی سانحہ سقوط بنگلہ دیش ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم کی حیثیت سے سارے منظر نامے کو دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ الطاف فاطمہ کے ناول چلتا مسافر اور سلمی اعوان کے تنہا کے بعد یہ اس موضوع پر تیسرا مفصل، وقیع اور نسبتاً غیر جانب دار بیانیے کا حامل ناول ہے۔ ناول کے مرکزی کردار کو سننا پڑتا ہے کہ ”اور ایک تم ہو۔ مغربی پاکستان کے نام پر دھبا، خیرل نے میرے دُبلے جسم پر پھبتی کسی۔“(۱۷) دیگر موقعوں پر بھی اس ناول میں بنگالی کرداروں کی زبانی دونوں خطوں کی معاشی حالت کے بارے میں موازنے

پر مبنی طنز محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مزاحیہ عناصر کے حوالے سے طارق محمود اس ناول میں واقعاتی مزاح، جگت بازی اور اردو کے ثقیل الفاظ کا مضحک بنگالی تلفظ پیش کر کے قاری کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔

انتظار حسین کے دو ناول تذکرہ اور آگے سمندر ہے اسی زمانے میں منظر عام پر آئے۔ تذکرہ میں بھی انتظار حسین کے سابقوں ناولوں کی طرح مافوق الفطرت مضحک قصے پیش کیے گئے ہیں لیکن ان کی پیش کش کا انداز قدیم داستانوی رنگ کا ہے۔ دھیمے لہجے میں (جو انتظار حسین کی پہچان بھی ہے) مضحک صورت حال کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار شہر کی ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر ایک رکشہ میں بیٹھ کر بینک پہنچنا چاہتا ہے۔ جھٹکوں سے عاجز آکر وہ رکشے والے سے کہتا ہے۔" بھئی رکشہ والے مجھے تم بینک پہنچا دو گے مگر پسلیوں سمیت پہنچاؤ تو اچھا ہے۔"اس طرح کے نیم مزاحیہ مکالمے ناول میں اکثر و بیش تر نظر آتے ہیں۔ قبل ازیں شائع ہونے والے چاند گہن، بستی اور تذکرہ کے مقابلے میں آگے سمندر ہے اپنے موضوع کے حوالے سے انفرادیت رکھتا ہے۔ اس ناول کا لوکیل تقسیم کے فوراً بعد کا کراچی شہر ہے۔ جواد میاں سے منسلک کچھ مضحک کردار بھی اس ناول میں ملتے ہیں۔ مصنف نے کہیں کہیں مضحک واقعات سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ازدواجی رشتے کی نوک جھونک یہاں بھی وافر ملتی ہے۔ دیگر ناولوں کے برعکس اس ناول میں طنزیہ عناصر کی بہتات ہے۔ تقسیم کے نتیجے میں ہونے والی اتھل پتھل سے کراچی شہر کی تہذیبی وحدت گم ہو کر رہ گئی ہے۔ ناول کا ایک کردار کہتا ہے کہ" جواد میاں یہ ست خصمی شہر ہے۔۔۔یاروں نے یہ شہر بسایا ہے یا کھچڑی پکائی ہے۔" مجموعی طور پر انتظار حسین کے ہاں اُن کے اُسلوب کی طرح طنزیہ و مزاحیہ عناصر میں بھی ایک ٹھہراؤ اور سنبھلی ہوئی کیفیت ملتی ہے۔

شوکت صدیقی نے جانگلوس 'میں "خدا کی بستی" کے سروکاروں کو زیادہ بڑے کینوس کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔ کم و بیش اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل یہ ضخیم ناول وسطی پنجاب کی دیہی زندگی کے مسائل کو موضوع بناتا ہے۔ جرم کی پُراسرار دنیا میں سیاسی سرپرستیاں، اشرافیہ کا تہہ دار طرزِ زندگی، جاگیرداری نظام کی خرابیاں، حکومتی اور عوامی اداروں کا رویہ، سیاسی و معاشرتی استبداد اور طبقاتی جدوجہد سبھی کچھ اس ناول میں بڑے منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پاکستان ٹیلی وژن سے اس ناول کی ڈرامائی تشکیل نے اسے عوامی شہرت سے آشنا کیا۔ معاشرتی سطح پر جرم ہمیشہ جاہل طبقہ ہی نہیں کرتا رہا بلکہ پڑھے لکھے اور نام نہاد باشعور طبقے نے بھی وطن عزیز کو زیادہ بے دردی سے لوٹا ہے۔ مرکزی کردار کہتا ہے:"میں تو

جی کوڑے کا ڈھیر ہوں، کوڑے کے ڈھیر پر پلا اور کوڑے کے ڈھیر پر ہی رہا، کھاد بھی نہ بن سکا مگر تمھارا خصم.... میاں حیات محمد کیسے جرائم پیشہ بن گیا، وہ تو جی ولایت سے بیرسٹری پڑھ کر آیا ہے، کنون کو پوری طرح جانتا ہے۔"(۱۸) جرم کی دلدل میں دھنسے شخص کے مکالمے سے ایسی ہی صورت حال پر طنز کیا جا رہا ہے۔ غرض اس ناول کی تینوں جلدوں میں واقعاتی مزاح، مضحک مکالمات اور سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی طنز کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اسی عہد میں نثار عزیز بٹ کا ایک مختصر سا علامتی نوعیت کا ناول "دریا کے سنگ" بھی زیرِ تبصرہ ہے۔ نثار عزیز بٹ کے دیگر ناولوں کے برعکس اس ناول کا مرکزی کردار مرد ہے جو ایک ناآسودہ روح کا حامل ہے۔ اپنے ماجرے اور بیانیے دونوں کے اعتبار سے یہ ایک کم زور ناول ہے۔ اس عہد کے اگلے اہم ناول نگار مستنصر حسین تارڑ ہیں۔ تارڑ کے دو اہم ناول بیسویں صدی کی آخری دہائی میں شائع ہوئے۔ پہلا ناول "بہاؤ" ہے جس نے تارڑ کی تخلیقی زندگی کا رُخ ناول نگاری کی طرف موڑ دیا۔ دریائے سرسوتی کے کنارے موئن جو داڑو اور ہڑپہ کے مماثل تہذیبی زندگی کے تباہ ہونے کا منظر نامہ ہے۔ مستند معلومات اور مضبوط تخیل کے امتزاج سے مصنف ایسی کہانی تشکیل دینے میں کام یاب ہو گئے ہیں کہ ناول کا قاری اور ناقد دونوں داد دیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ مادری نظام کی مرکزیت کا حامل یہ ناول سماجی طنز کے مختلف حربوں سے مزین ہے۔ تارڑ کا اگلا ناول راکھ ہے۔ مرزا اطہر بیگ اسے تارڑ کا سب سے بہترین ناول قرار دیتے ہیں۔(۱۹) یہ ناول متنوع موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ مغربی پاکستانی کی سیاسی و سماجی صورت حال، عصری تناؤ، مشرقی پاکستان کی علیحدگی جیسے موضوعات ناول کے ماجرے میں پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ یوں تو پورے ناول میں سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی طنز بکھرا ہوا ہے لیکن جہاں جہاں مصنف نے مشرقی پاکستان کے کرب کا ذکر کیا وہاں طنز کی شدت اور تلخی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کا سانحہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں پیش آیا۔ مصنف ناول کے ایک کردار کی زبانی دسمبر کی سردی کا ذکر کرتے ہوئے اس درد کو یاد کرتا ہے اور طنزاً کہتا ہے کہ "دسمبر تو ہم پاکستانیوں نے کتنی ڈھٹائی اور ریت میں سر چھپا کر برداشت کیا۔" ناول میں سرکاری صحافتی اداروں کے معیار پر بھی طنز ملتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس ناول کے پیرایے میں لکشمی مینشن میں گزرے ہوئے اپنے بچپن کی یادیں بھی تازہ کی ہیں۔ راکھ کا یہ پہلو جہاں اسے خود نوشت سوانحی ناول کے طور پر پیش کرتا ہے وہیں 'لکشمی کراوُڈ' کی ذیل میں مستنصر حسین تارڑ نے مضحک واقعات، بچوں کی معصوم شرارتیں اور اس زمانے میں لاہوریوں کی زندہ دلی کے تذکرے سے قاری کو زیرِ لب تبسم سے آشنا بھی کیا ہے۔

بیسویں صدی کے پاکستانی اُردو ناول میں طنزیہ و مزاحیہ عناصر کا بحیثیت مجموعی جائزہ لیں تو ایک تنوع سے سابقہ پڑتا ہے۔ وطن عزیز کے سیاسی و سماجی حالات میں آنے والے نشیب و فراز نے ناول کی تخلیقی دنیا کو بھی اُسی انداز سے متاثر کیا ہے۔ اسی طرح عالمی طور پر تبدیل ہوتی ہوئی معاشرتی قدریں اور پہلے سے طے شدہ قدروں کی پامالی نے بھی طنزیہ و مزاحیہ عناصر کو اکثر اوقات ایک اساس فراہم کر دی ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد سے دورِ حاضر تک کے ناول میں جہاں ایک معاصر تاریخ بکھری ہوئی ہے وہیں جابہ جا طنز و مزاح کے پیرایے میں ان بدلتے منظر ناموں کی عمدہ تصویر کشی بھی ملتی ہے۔ ناول کے ماجرے میں جس بیانیے کا اظہار بین السطور ملتا ہے، طنز کی آمیزش اس کے احساس میں نمایاں اضافہ کر دیتی ہے۔ پاکستانی اُردو ناول میں طنزیہ و مزاحیہ عناصر اور اس کی پیش کش کے مختلف حربے وقت کے ساتھ ساتھ کہیں زیادہ فنی پختگی کے ساتھ وقوع پذیر ہوئے ہیں اور یہ سفر بدستور جاری و ساری ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) صغیر افراہیم، اُردو فکشن تنقید اور تجزیہ، (علی گڑھ: ایجوکیشنل بُک ہاؤس، ۲۰۰۳ء)، ۲۶۳۔

(۲) محمد اشرف کمال، اُردو ناول۔ تاریخ و ارتقاء (کراچی: رنگ ادب پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ۱۵۔

(۳) عبدالسلام، اُردو ناول بیسویں صدی میں، (کراچی: سندھ اُردو اکیڈمی، ۱۹۷۳ء)، ۶۵۳۔

(۴) محمد حسن، جدید اُردو ادب، (کراچی: غضنفر اکیڈمی، س۔ن)، ۴۱۔

(۵) شاہد نواز، پاکستانی اُردو ناول میں عصری تاریخ، (فیصل آباد: مثال پبلیشرز، ۲۰۱۸ء)، ۱۰۴۔

(۶) محمد احسن فاروقی، شام اودھ، (لکھنؤ: الوعظ صفدر پریس، س ن)، ۲۳۳۔

(۷) صلاح الدین درویش، آگ کا دریا کا اسلوبیاتی مطالعہ، مشمولہ تناظر، (گجرات: سوشیو لٹریری فورم، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء)، ۳۰۶۔

(۸) عبداللہ حسین، اداس نسلیں، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ۷۷۔

(۹) ایضاً، ۲۵۔

(۱۰) ممتاز احمد خان، اُردو ناول، کرداروں کا حیرت کدہ، (کراچی: فضلی سنز، ۲۰۱۵ء)، ۱۶۸۔

(۱۱) وحید الرحمن خان، محمد خالد اختر: ایک بے مثال پیروڈی نگار، (کراچی: قومی زبان، ۲۰۰۸ء)، ۲۲۔

(۱۲) غفور شاہ قاسم، حجاب امتیاز علی کا فن، مشمولہ قومی زبان، (کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، مارچ ۲۰۱۲ء)، ۳۳۔

(۱۳) زاہد حسن۔ عبداللہ حسین، ایک بے رحم حقیقت نگار، مشمولہ ادبیات، عبداللہ حسین نمبر۔ (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۸ء)، ۱۸۶۔

(۱۴) محمد شعیب خان، مشمولہ ادبیات، عبداللہ حسین نمبر، (اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،اپریل تا ستمبر ۲۰۱۸ء)،۳۶۲۔

(۱۵) صدیق سالک،پریشر ککر، (لاہور:الفیصل،۲۰۱۰ء)،۱۴۶۔

(۱۶) محمد فرید،ناول دشت سوس کا موضوعاتی مطالعہ، مشمولہ مجلہ تاریخ و ثقافت پاکستان، (جولائی۲۰۱۸ء)،۵۶۔

(۱۷) طارق محمود،اللہ میگھ دے، (ملتان:کاروان ادب،۱۹۸۶ء)،۱۱۹۔

(۱۸) شوکت صدیقی،جانگلوس (حصہ اول)، (کراچی:رکتاب،۱۹۸۷ء)،۱۹۷۔

(۱۹) انٹرویو نجیبہ عارف۔۸ فروری۲۰۱۹ء http://daanish.pk/32734

BIBLIOGRAPHY

- Abdullah Husain, *Ūdās Naslaiṉ*, (Lahore: Sang-e Meel, 2008).
- AbdusSalam, *Urdū Novedl Bīsvī Sadi meṉ*, (Karachi: Sindh Urdu Acedimi, 1973).
- Ghafoor Shah Qasim, Hijab Imtiaz Ali ka Fun, (Incl.) *Qaomi Zubān*, (Karachi: Anjuman-e Taraqqi-e Urdu Pakistan, March 2012)
- Muhammad Ahsan Farooqi, *Shām Odh*, (Lakhnaw: Alwaz Safder Press).
- Muhammad Ashraf Kamal, *Urdū Novel : Tarīkh-o Irtaqah*, (Karachi: Rang Adab Publications, 2017).
- Muhammad Fareed, Novel Dasht Soos ka Mauzuati Mutala, (Incl.) *Tarīkh-o Saqafat Pakistan*, (July, 2018).
- Muhammad Hasan, *Jadīd Urdū Adab*, (Karachi: Ghazanfer Acedemi).
- Mumtaz Ahmad Khan, *Urdū Novel, Kedaroṉ ka Hairat Kada*, (Karachi: Fazli Sons, 2015).
- Sagheer Afraheem, *Urdū Fiction Tanqīd aur Tajzia*, (Ali Garh: Education Book House, 2003)
- Salah al-Deen Darwish, Aag ka Darya ka Asloobyati Mutala, (Incl.) *Tanāzur*, (Gujrat: Soshu Leterary Fourm, January- June 2012)
- Shahid Nawaz, *Pākistānī Urdū Novel meṉ Asrī Tarīkh*, (Faisalabad: Meesal Publishers, 2018)
- Shaukat Siddiqee, *Jaglūs*, (Karachi: R Kitab, 1987).
- Sideeq Salik, *Parashar Kukkar*, (Lahore: Al-Faisal, 2010)
- Tariq Mahmood, *Allah Megh Day*, (Multan: Karwan Adab, 1986).
- Waheed ur Rehman Khan, *Muhammad Khalid Akhtar; Aik hai be Misal Peerodi Nigār,* (Karachi: Qaomi Zuban, 2008.
- Zahid Hasan, Abdulllah Husain, Aik Be Reham Haqeeqat Nigar, (Incl.) *Adabiat: Abdullah Hasan Number*, (Islamabad: Aecedmi Adabiat Pakistan, April- September 2018).

❖❖❖